Rooh-e-Tahqeeq, Vol.04, No.01, Serial No. 11, January – March 2026

Contemporary Urdu Novel Across the Border (In the Context of Selected Novels)

سرحد پار کا معاصر اُردو ناول (منتخب ناولوں کے تناظر میں)

Dr.Muhammad Abu Bakar Faruqi
Lecturer of Urdu,University of Gujrat
dr.m.abubakar@uog.edu.pk

Ambreen Amjad
Lecturer of Urdu,University of Gujrat
ambreen_Amjad@uog.edu.pk

Zainab Fatima
Lecturer of Urdu,ILM College,Gujrat
zainabfatima20091995@gmail.com

Abstract:
In the contemporary era, the Urdu novel has not only flourished in Pakistan but has also encompassed diverse themes across the border. Along with thematic richness, successful experiments have been carried out in language, expression, and narrative techniques. Undoubtedly, writers from across the border have played a significant role in enriching the Urdu novel in this period. In this paper, selected novels are analyzed in the context of cross-border Urdu fiction to examine in which ways these works have contributed to the development and expansion of Urdu literature.

Keywords:
Urdu novel, Urdu fiction, Urdu literature, Pakistan, Narrative techniques

ناول کے بارے میں عمومی خیال تو یہی ہے کہ یہ اپنے زمانے کا اظہار یہ ہوتا ہے یا اپنے سماج کا تخلیقی بیانیہ کَہ لیں تو اور بھی بہتر ہے؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب سے ناول معرض وجود میں آیا ہے تعریفوں کی زد پر رہا ہے۔ ڈی ایچ لارنس نے ناول کو زندگی کی ایسی کتاب کہا جو زندہ انسان کی سالم صورت کا ادراک رکھتی ہے۔(۱) دوسری طرف رالف فاکس کے بقول "ناول۔۔۔ فرد کی معاشرے اور فطرت کے خلاف عظیم جدوجہد اور کش مکش کی داستان ہے۔"(۲) دونوں باتیں بڑی درست ہیں لیکن بعد میں آنے والے کچھ ناول نگاروں نے ناول کی معنوی جہات کو مزید وسیع کر دیا۔ آج کے ایک معروف ناول نگار میلان کنڈیرا نے یہ کَہ کر کہ "ہر عہد کے تمام ناول انسانی وجود کی پہیلی سے متعلق رہے ہیں۔"(۳) ناول کا رشتہ انسانی وجود سے جوڑ دیا۔ جب ناول سے متعلق حقیقت اور سچائی کے حوالے سے سوالات پیدا ہونے لگے تو ماریو برگس یوسا نے کہا کہ "فکشن ایک دروغ ہے جو ایک عمیق صداقت کو ڈھانپے ہوتا ہے۔"(۴) اور گارشیا مارکیز نے یہ کَہ کر کہ "اگر ناول نگار اپنے قاری سے یقین کروا سکتا ہے تو پھر ناول میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔"(۵) ناول کی طاقت کا اعتراف کیا۔ غرض یہ کہ ناول نے اپنی اہمیت کو نہ صرف ثابت کیا بلکہ دوسروں سے خود کو منوایا بھی ہے۔

صنعتی عہد کی اِس سب سے بڑی ادبی صنف نے پوری دنیا کے زبان و ادب میں اپنی جگہ بنائی۔ ہندوستان میں اُردو زبان کے ناول نگاروں نے بھی انیسویں صدی سے لے کر اب تک اپنے شاہ کار اِس صنف میں پیش کیے۔ اکیسویں صدی کے

آس پاس سے اُردو ناول نے ہندوستان میں نئے سِرے سے عروج پکڑا تو کئی اہم ناول منظر عام پر آئے۔ اِن میں الیاس احمد گدی کا "فائر ایری"، عبدالصمد کا "دو گز زمین"، پیغام آفاقی کا "مکان"، غضنفر کا "پانی" اور سید محمد اشرف کا "نمبر دار کا نیلا" بہ طور خاص ذکر کے قابل ہیں۔

جب کہ اکیسویں صدی میں ایک طرف مشرف عالم ذوقی کے "پوکے مان کی دنیا" کے ساتھ ساتھ "پروفیسر ایس کی عجیب داستان"، "آتش رفتہ کے سراغ"، "نالۂ شب گیر"، "مرگِ انبوہ" اور "مردہ خانے میں عورت" جیسے ناول سامنے آئے تو دوسری طرف شمس الرحمن فاروقی کے "کئی چاند تھے سرِ آسمان" اور "قبضِ زماں"، شموئل احمد کا "اے دلِ آوارہ"، خالد جاوید کے "موت کی کتاب" اور "نعمت خانہ"، انیس اشفاق کے "دکھیارے"، "خواب سراب" اور "پری ناز اور پرندے"، صدیق عالم کے "صالحہ صالحہ"، "چینی کوٹھی" اور "مرزبوم"، شفق سوپوری کے "نیلیما"، "فائرنگ رینج کشمیر" اور "موسیٰ"، رحمن عباس کے "روحزن" اور محسن خان کے "اللہ میاں کا کارخانہ" نے ناول کے خزانے میں قیمتی اضافے کیے۔ ہندوستان میں اُردو ناولوں کی اِس کہکشاں کی بنیاد پر شہاب ظفر اعظمی کا یہ کہنا بجا لگتا ہے:

> "اکیسویں صدی میں ہندوستان کا اُردو ادب مجموعی طور پر ناول کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوا ہے۔ ہمارے ناول نگاروں اکیسویں صدی کی موجودہ زندگی کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ شاید ہی عوام وخواص کی زندگی کی کوئی صورت ان کی گرفت اور اظہاریت سے چھوٹی ہو۔۔۔ طریق کار کے پرانے فریم ورک ٹوٹ چکے ہیں اور ناول نگار پیچیدہ کیفیات پیش کرنے کے لیے الفاظ اور زبان کے سراب آمیز میدانوں سے گزر رہے ہیں"(۶)

بہر حال یہاں ہم اپنے مطالعے کے لیے جن چار ناولوں کو منتخب کر رہے ہیں (کہ سب ناولوں کا مطالعہ ممکن نہیں) وہ درج ذیل ہیں:

> ۱۔ "کئی چاند تھے سرِ آسماں" از شمس الرحمن فاروقی؛ ۲۔ "پوکے مان کی دنیا" از مشرف عالم ذوقی
> ۳۔ "موت کی کتاب" از خالد جاوید؛ ۴۔ "خواب سراب" از انیس اشفاق

"کئی چاند تھے سرِ آسمان" بلاشبہ اکیسویں صدی کا وہ اُردو ناول ہے جس نے اُردو میں ناول سے متعلق پیدا ہوتے تمام شک وشبہات مٹا کر رکھ دیے؛ اور یہ ثابت کیا کہ بڑا ناول آج بھی پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کر سکتا ہے اور ادبی حلقوں میں موضوعِ بحث بھی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ "کئی چاند تھے سرِ آسماں" اس صدی کا ایک بڑا ناول گنا جاتا رہے گا۔

یہ ناول بنیادی طور پر انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب میں انسانی سروکاروں کا مرقع ہے۔ ناول کے کردار اپنے عہد کی زبان بولتے ہوئے، اپنے اصل تاریخی ناموں اور مقاموں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ کرداروں کے ساتھ ساتھ مکالمے اور مناظر بھی انتہائی جان دار ہیں۔ بقول سیّد ارشاد حیدر:

> "اس میں بہت سے کردار بھی ہیں جو اپنی نفسیات اور فطرت کے اعتبار سے زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس میں جابجا ڈرامائی انداز بھی ہے اور مکالمے، جو ڈرامے کی جان ہوتے ہیں، اس ناول کے اندر ڈرامے سے بھی زیادہ طاقت ور ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار وزیر خانم مغلیہ سلطنت کے ٹوٹتے ہوئے اقتدار کی علامت کے طور پر اور ولیم فریزر انگریزی حکومت کے جبر اور اقتدار کی علامت کے طور پر لائے گئے ہیں، لیکن اس ناول کے بقیہ سبھی کردار علامتی نہیں ہیں۔"(۷)

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس ناول کو سب سے زیادہ جس چیز نے منفرد بنایا ہے وہ اس کی زبان ہے۔ فاروقی نے اس میں زبان و بیان کا وہ کمال کیا ہے کہ یہ معجزہ کسی حیرت سے کم نہیں۔ اُنھوں نے جس عہد کو اپنے ناول کے لیے منتخب کیا اُسی عہد کی زبان کو بھی اِس میں پوری طرح نبھا کر دکھایا۔ پھر بڑا کمال یہ ہے کہ زمانی اعتبار سے ناول کے واقعات جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں زبان میں فرق آتا جاتا ہے حتیٰ کہ مقام کی تبدیلی سے بھی زبان تبدیل ہوتی ہے۔ یعنی زبان کو زمانی اور مکانی ہر دو طرح کی تبدیلیوں کے اثرات کے تحت برتا گیا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف الفاظ کا استعمال بڑی جاں فشانی اور تحقیق طلب کام تھا۔ اس ضمن میں یہ بات درست ہے:

> "یہ الفاظ مصنف نے کہاں کہاں سے تلاش کیے ہوں گے؟ اغلب کہ یہ الفاظ اس مخصوص طبقے کی عام بول چال کے رہے ہوں گے۔ بہر حال یہ تو طے ہے کہ الفاظ کی عمیق تحقیق کے بعد ان سے ایک نئی زبان بنانا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔"(۸)

گو طرح طرح کے حالات اور واقعات کی کثرت کی وجہ سے کئی طرح کے کردار اُبھر کر سامنے آتے ہیں جن کی حیثیت بنیادی نوعیت کی ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بنیادی طور پر اس ناول کا مرکزی کردار "وزیر خانم" ہی ہے۔ انتظار حسین کا یہ کہنا بلاوجہ نہیں کہ "وہ ایک عظیم عورت ہے، اتنی عظیم کہ اُس کے سامنے ملکہ ہندوستان نواب زینت محل بھی گھٹ کر ایک معمولی درجے کی جھگڑالو عورت معلوم ہونے لگتی ہے۔"(۹) بے شک انتظار حسین کی یہ بات درست ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے اس بیان سے اس کردار (وزیر بیگم) کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> "ہوش سنبھالنے کی عمر کے آتے ہی وزیر کو اپنے حسن کی ساحرانہ کشش اور اپنی روح میں انگڑائیاں لیتی ہوئی موہنی کا احساس ہو گیا تھا۔ خود پر اعتماد اور پھر مدتوں کی معشوقی نے اس میں ایک دل فریب مگر آسانی سے تسخیر نہ ہو سکنے والا انداز تبختر پیدا کر دیا تھا۔ تجربۂ زیست نے اُسے بھلے بُرے کی تمیز اور عام چاہنے والوں کے تئیں عام طور پر رعونت کا برتاؤ بھی سکھا دیا تھا۔ اسے اپنی تکمیل کے لیے مرد کی ضرورت نہ تھی۔ مرد کے ذریعے وہ اپنی شخصیت اور وجود کا اثبات چاہتی تھی۔"(۱۰)

لہٰذا بہ ظاہر کم زور بنی وہ طاقت ور مردوں کے دلوں پر راج کرتی پھرتی ہے۔ ہر مرد کے ساتھ اُس کی "گفتگو ایسی رجھاتی ہوئی دل نشیں ہوتی ہے گویا وہی پہلا مرد ہے جو اُس کی زندگی میں آیا ہے۔ بلاشبہ Seduction Power کی مالک ہے اور اپنی اس خوبی سے آگاہ بھی ہے۔"(۱۱)

گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں وزیر بیگم کی داستان بیان ہوئی ہے لیکن اس کے توسط سے یہ ناول اُس عہد کی پوری تہذیب کی کہانی سنانے میں کامیاب ہُوا ہے۔ بے شک فاروقی نے اپنے اس ناول کے ذریعے عہد گزشتہ کے ادب اور تہذیب کو زندہ کر دینے کا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اور یہ کارنامہ سر انجام اس طرح دیا گیا ہے کہ اس میں حقیقت اور تخیل کی ایسی آمیزش کی ہے جو اسے بہ یک وقت تاریخ اور فکشن کا ایک شاہ کار بنا دیتی ہے۔ اس کی جدت اور ندرت کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ اس کے کردار اور واقعات حقیقی بھی ہیں اور فرضی بھی؛ یعنی حقیقت اور افسانہ دونوں اس ناول میں ایک ہو گئے ہیں۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ سب کچھ کے باوجود یہ ناول، ناول رہتا ہے جس نے ایک کردار کے ذریعے اُس سارے عہد کے المیے کو بیان کر دیا۔

مشرف عالم ذوقی ایک بہت فعال ناول نگار و افسانہ نویس ہیں۔ وہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے ناولوں کا موضوع بنانا پسند کرتے ہیں اس لیے اُن کے ناولوں میں واضح انفرادیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ:

"بدلتی ہوئی تہذیب، بدلتے ہوئے عہد کا گواہ ادیب کو بننا پڑتا ہے۔۔۔ اگر لکھنے والا اپنے عہد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چلتا ہے تو وہ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔"(۱۲)

لہٰذا وہ اپنے ہر ناول میں اپنے عہد کے کسی نہ کسی گھمبیر مسئلے کو لے کر چلتے ہیں۔ اُنھیں انسانی زندگی کے موجودہ مسائل کو کہانی میں ڈھالنے کا فن خوب آتا ہے۔ "پوکے مان کی دنیا" اِس کی ایک واضح اور بڑی مثال ہے۔ سائبر کرائم کے موضوع پر شاید ہی کسی اور نے ناول لکھا ہو۔ بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ آج انٹرنیٹ نے ہمارے بچوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں کر لیا ہے اور اُن کی ذہنیت میں ایسی ایسی تبدیلیاں کی ہیں کہ ہماری تہذیبی اور اخلاقی اقدار کا ملیامیٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ بقول ایم۔ خالد فیاض:

"بلاشبہ آج کے بچوں کی دنیا بدل چکی ہے۔ اُن کے ہیرو بدل چکے ہیں، اُن کا کردار اُن کے اعمال بدل چکے ہیں کیوں کہ نئی ٹکنالوجی نیا سسٹم آ گیا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اِس سسٹم کا حصہ بننا پڑ رہا ہے۔ ناول میں اِسی کش مکش کو خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ بڑی عمر کی جنریشن یہ جانتے ہوئے بھی کہ بچے کمپیوٹر اور کمپیوٹر گیمز کی وجہ سے ایک خطرناک دَور میں داخل ہو چکے ہیں لیکن اِس کے باوجود کچھ کر سکنے کے قابل نہیں۔ ایک رُخ سے دیکھیں تو "پوکے مان کی دنیا" اصل میں اِس المیہ کا بیان بھی ہے۔"(۱۳)

اسی لیے ناول کا ایک کردار سنیل جب یہ کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہے کہ:

"آج کے بچے اتنا تیز اُڑ رہے ہیں کہ ہماری پکڑ میں ہی نہیں آ سکتے ہیں۔ نئی ٹکنالوجی صرف نئی اور بھیانک بیماریاں ہی دے سکتی ہے اور ہمیں ایک ایسی نفسیات میں مبتلا کر سکتی ہے جس کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں ہے۔"(۱۴)

اور پھر یہ کہ:

"یہ بچے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ سارے گناہ، سارے ناجائز غلط دھندے، یہ بچے اگر پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایپ کرنے لگیں تو مجھے حیرت نہیں ہو گی۔ وہی تمھارا نئے زمانے کا ڈائناسور---- یہ ڈائناسور تمھارے جوراسک پارک کے ڈائناسور سے زیادہ بھیانک ہے۔ وہ حملہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے یہ حملہ کرتے ہیں تو پتا بھی نہیں چلتا اور جب پتا چلتا ہے تو کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"(۱۵)

یہی المیہ ہے جس کو اِس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اور آج کے اس المیے کے اتنے زیادہ Shades دکھائے گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بقول تسنیم فاطمہ امروہوی "آج کی مشکل ترین زندگی اور بے باک تہذیب کا منظر اس ناول میں بے لاگ پیش کیا گیا ہے۔"(۱۶) ایسی تہذیب جس میں ایک بارہ سال کا لڑکا انٹرنیٹ کے زیر اثر اپنے سے بھی چھوٹی لڑکی کا ریپ کر دیتا ہے۔ یوں مشرف عالم ذوقی نے اپنی روایتوں اور تہذیب کا خون ہوتا دکھایا ہے جسے آج کی اس سائبر دنیا میں روکنا ممکن نہیں رہا۔ ناول نگار نے اصل میں گلوبلائزیشن کے بڑھتے ہوئے اثرات کو واضح کیا ہے اور بین السطور اس طرف دھیان دلانے کی کوشش کی ہے کہ مشرقی ممالک اور اقوام کے لیے اس حوالے سے کیسے کیسے چیلنجز جنم لے رہے ہیں اور لے سکتے ہیں۔ اس سارے معاملے میں سیاست کا بھی جو کردار ہے وہ بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ محمد اکرم خان کے بقول:

"مصنف نے نابالغ بچوں کو کردار بنا کر ہندوستان کی گندی سیاست سے پردہ ہٹانے کی سعی کی ہے۔۔۔ (اور) سیاست کے دوسرے حربوں کی طرف بھی ہمیں متوجہ کیا ہے کہ سیاسی لوگ کس طرح معاشرے میں فرقہ واریت اور فسادات برپا کر کے اپنا اقتدار قائم کرنے کا جتن کرتے ہیں۔"(۱۷)

خالد جاوید کا ناول "موت کی کتاب" ایک دھماکے سے اُردو دنیا میں وارد ہُوا۔ ایک بالکل انوکھی فضا، انوکھا احساس اور نرالا ڈکشن اور اسلوب لیے یہ ناول، ادبی بحث کا موضوع بن گیا۔

بہ ظاہر ناول کا پلاٹ بالکل سیدھا ہے۔ واقعات کی ترتیب تھوڑی آگے پیچھے ہونے کے باوجود واقعات میں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ پیچیدگی اصل میں ناول نگار کے تصور حیات میں ہے اور وہی اس ناول کو پیچیدہ بناتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اس ضمن میں بڑے پتے کی بات کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "خالد جاوید کا تصور حیات، یا زندگی کے بارے میں اُن کی رائے اور اُن کا واقعی تجربہ، ہمت شکن ہیں۔ ان کی قوت اس بات میں ہے کہ وہ ایسے تصور حیات کا تصور کر سکتے ہیں، اور اس سے زیادہ اس بات میں، کہ وہ ایسے تصور حیات، یا ایسے ہمت شکن تجربے کو بیان کرنے کے لیے مناسب نثر کے مالک ہیں۔"(۱۸)

خالد جاوید کے ہاں زندگی کا تجربہ ہولناک بھی ہے اور اذیت پسندانہ بھی جو کراہیت کے عناصر بھی پیدا کرتا ہے اور زندگی کی ایک انتہائی منفی لیکن سنگلاخ قسم کی سچی تصویر بھی دکھاتا ہے۔ خالد جاوید کا احساساتی نظام، زندگی کا جو تصور باندھتا ہے وہی اُن کی تحریروں، خاص طور پر اس ناول "موت کی کتاب" میں نظر آتا ہے۔ بقول آصف فرخی "غیر ضروری تفصیلات کو منہا کرتے کرتے، واقعیت کی پرتیں ہٹاتے اور الگ کرتے کرتے خالد جاوید صرف اس عنصر سے کہانی لکھتے ہیں جسے اذیت ناک بیانیوں کا ایک اور خالق سیموئیل بیکٹ، قصے کے Bare Bones قرار دیتا ہے۔"(۱۹) اس بات کے ثبوت کے لیے ناول کے ایک دو اقتباسات دیکھ لینے چاہئیں۔ یہ دیکھیے:

> "مجھے مباشرت کی شدید خواہش ہوئی ہے، میں کسی شیرنی سے مباشرت کرنا چاہتا ہوں۔ میری بیوی اور آس پاس کی عورتیں مجھے حقیر چوہیوں کی مانند زمین پر رینگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں ان ساری عورتوں کو اپنے وزنی پاؤں کے نیچے دیر تک دبانے کے بعد مار دینا چاہتا ہوں، پھر اُن کی چٹیوں کو ان کی دموں کی طرح پکڑ کر نالی میں دُور پھینک دینا چاہتا ہوں۔"(۲۰)

اور پھر یہ کہ:

> "گرمی سے میرے جسم پر چیچک کے مواد بھرے دانے نکل آئے ہیں۔ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ کر پھینک دیے۔ مجھے کوئی شرم نہیں۔ بے شرم تو یہ دنیا ہے، میرا باپ ہے، میری بیوی ہے۔۔۔ میں ننگا گھوم رہا ہوں، ان سب کے منھ میں پیشاب کرتا ہُوا۔"(۲۱)

اذیت، کراہت اور بے شرمی کا یہ بیانیہ خالد جاوید ہی رقم کر سکتے ہیں۔ یہ اُس دنیا کا اظہار یہ ہے جس نے اپنے اوپر تہذیب کے غلاف چڑھا رکھے ہیں، خالد جاوید صرف اتنا کرتے ہیں کہ اس غلاف کو دنیا کے بدن سے کھینچ لیتے ہیں اور جو صورتِ حال سامنے آتی ہے اُسے صفائی سے بیان کر دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہاں موت سیدھی سادی لکیر میں سفر کرنے والی شے نہیں بلکہ یہ موت ہی ہے جو اپنے کرداروں کو زندگی کا احساس کراتی ہے۔ یہاں موت جو خودکشی کی شکل میں آتی ہے اور بار بار مرکزی کردار کو خودکشی پر اُکساتی ہے، کہیں معروض سے نہیں بلکہ کردار کے داخل سے نمودار ہوتی ہے۔

سارا ناول واحد متکلم کی تکنیک میں ہے اور خودکلامی پر مبنی ہے، اس لیے اس میں مکالموں کی گنجائش نہیں نکلتی۔ مکالموں کی اپنی اہمیت سہی لیکن کچھ بیانیوں کا تقاضا یہی خودکلامی ہوتی ہے جسے خالد جاوید نے اپنے ناول کے لیے مناسب سمجھا۔ اسی لیے سیّد محمد اشرف نے لکھا ہے:

"موت کی کتاب میں آپس کے مکالمے نہ کے برابر ہیں لیکن راوی واحد متکلم کی زبان میں سب کی تلافی کر دیتا ہے۔ مکالمے تو الگ الگ کرداروں کے سیاق وسباق میں الگ الگ لہجوں میں ہی زیادہ فطری لگتے ہیں لیکن اس تحریر میں جو شدت تاثر پیدا ہوا ہے، اس کا بڑا حصہ اس بیان کی وجہ سے ہے جو واحد متکلم ادا کرتا ہے"(۲۲)

یوں یہ ناول جو بہ ظاہر ہماری اِرد گرد کی دنیا کے دُکھ اور درد ہی کو بیان کرتا ہے بہ باطن زندگی کے ان مخفی گوشوں تک بھی لے جاتا ہے جہاں آج کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی بھی نہیں پہنچ سکتی۔ یہ ذاتی مشاہدات اور تجربات کا ایسا بیانیہ ہے جو اجتماع کو اپنی گرفت میں لے لینے کی بے پناہ طاقت رکھتا ہے۔

کسی ناول کو موضوع بنا کر ناول لکھنے کی مثال انیس اشفاق نے اپنے ناول "خواب سراب" میں پیش کی۔ ناول نگار نے اپنے اس ناول میں "امراؤ جان ادا" کو موضوع بنایا، اُن کے مطابق مرزا ہادی رسوا کا شائع کردہ "امراؤ جان ادا" کا متن اصل متن کا تصحیح شدہ دوسرا متن ہے۔ ناول کے راوی کے بقول رسوا نے اس کے کئی متن تحریر کیے تھے۔ اُن میں سے ایک متن میں امراؤ جان کی اولاد کا ذکر بھی تھا۔ لہٰذا ناول کے راوی کو اُس کا تجسّس امراؤ جان کی کہانی جاننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

"بتانے والے بتاتے ہیں کہ رسوا نے وہ مسودہ جس میں امراؤ جان کے یہاں اولاد کا ہونا دکھایا گیا تھا، اپنے صندوق میں اس لیے رکھ دیا تھا کہ اُنھیں معلوم تھا کہ پڑھنے والے امراؤ جان کو ماں کی شکل میں قبول نہیں کریں گے۔ اپنے بڑوں کے بڑوں سے منتقل ہوتی ہوئی یہ بات جب میرے کانوں تک پہنچی اور جب میں اُسے سنتے سنتے بڑا ہُوا تو میرے دل میں خیال پیدا ہُوا کہ معلوم کروں کہ امراؤ جان کی اصل کہانی کیا وہی ہے جس کا مسودہ رسوا نے الگ رکھ دیا تھا۔"(۲۳)

یوں اُس گم شدہ متن کی تلاش اس ناول کا محرک بنتی ہے۔ اور پھر اس تلاش کے لیے واقعات ترتیب پاتے ہیں اور ناول کا پلاٹ اپنی شکل وصورت واضح کرتا ہے۔ گم شدہ متن کی تلاش میں راوی لکھنؤ کے مختلف کرداروں سے ملتا اور مقامات سے گزرتا؛ لکھنؤ کا تہذیبی اور ثقافتی نقشہ بھی مرتب کرتا جاتا ہے۔ یعنی گم شدہ مسودے کی تلاش میں ناول کا سارا بیانیہ تشکیل پاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "خواب سراب" بقول عبدالرحمن "ایک موجود متن پر نیا متن تشکیل دینے کی بہت عمدہ مثال ہے۔"(۲۴) یعنی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ راوی کا مقصد حقائق کو سامنے لانا ہے اور یوں یہ دکھانے یا بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امراؤ جان ادا کی کہانی جو شائع ہو کر ہم تک پہنچی ہے وہ سچ نہیں، سچ وہ کہانی ہے جس کا متن گم شدہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "خواب سراب" کے متن کو قدیم لکھنؤ کی تہذیب و تمدن اور وہاں کے سماجی اور معاشرتی عناصر سے تشکیل دیا گیا اور خوبی یہ ہے کہ اس کے لیے کسی شعوری کوشش کا عمل دخل نہیں بلکہ ناول کا موضوع ہی ایسا لیا گیا ہے کہ خود بہ خود لکھنوی تہذیب کا بیانیہ رقم ہوتا چلا جاتا ہے۔ موقع محل کی مناسبت سے واقعات کے بیان کے ذریعے لکھنوی معاشرت اور تہذیب کی خوب صورت تصویریں انتہائی عمدگی سے دکھائی گئی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ جہاں رسوا کے لکھنؤ کا (ناول "امراؤ جان ادا" میں) ذکر ختم ہوا تھا وہیں سے انیس اشفاق کے لکھنؤ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ بلکہ معید الرحمن کا یہ کہنا بجا ہے:

"اس ناول کا اساس مرزا ہادی رسوا کا تشکیل کردہ لکھنؤ ہے۔ رسوا نے جس طرح امراؤ جان، بسم اللہ جان، خورشید جان، بوا حسینی، خانم اور فیض علی وغیرہ کرداروں کی مدد سے جس لکھنؤ کو اسطوری حیثیت عطا کی تھی، انیس اشفاق نے اُنہی کرداروں کو قدرے بدلے ہوئے انداز میں جدید عصری مسائل سے ہم آہنگ کر کے انھیں ایک نیا تناظر فراہم کر دیا ہے"(۲۵)

چوں کہ ناول کی بنیاد طوائف کا قصہ ہے، اس لیے ناول میں لکھنوی طوائفوں کا ایک ہجوم ہے اور اُن کی زندگی اور اطوار کے کئی رُخ دکھائے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ لکھنوی رسوم مثلاً محرم کی رسوم کا بڑا عمدہ بیان ملتا ہے۔ علاوہ ازیں چلتے پھرتے افراد اور مقامات لکھنؤ کی ثقافتی فضا کو پوری طرح عیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

مزید براں یہ کہ اس ناول میں پلاٹ کی منصوبہ بندی اور زبان کا فن کارانہ استعمال فنی طور پر اِس ناول کو توقیر بخشتا ہے۔ "خواب سراب" کے اسلوب کی خصوصیت پر ظہیر انور نے خصوصی روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

> "خواب سراب" میں اسلوب میں صفائی، شائستگی، ہم واری اور حیرت انگیز تازگی نظر آتی ہے اور یہ اسلوب ناول کی رفتار اور ماحول کی عکاسی میں معاون ہوتا ہے نیز حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے پیدا ہونے والی کیفیت کو بڑھانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی اسلوب نے ناول میں تہ داری اور فکر انگیزی پیدا کی ہے۔ ناول کی کہانی میں لکھنؤ کی دل نشیں فضا کے ساتھ محرم کے تذکرے، کربلاؤں، درگاہوں، امام باڑوں، مسجدوں اور محل سراؤں کا ایسا نگار خانہ تیار کیا گیا ہے جس کے آئنوں میں گزرا ہوا زمانہ ایک متحرک منظر کی طرح سامنے آنے لگتا ہے۔(۲۶)

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس صدی میں اُردو ناول کس قدر متنوع موضوعات اور تکنیکوں کے حامل بیانیے تخلیق کرنے میں پیش پیش ہے۔ گو اس مقالے میں سبھی ناولوں کا تجزیہ و مطالعہ ممکن نہیں تھا لیکن منتخب کردہ ناولوں کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ اُردو ناول اکیسویں صدی میں بھی کامیابی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ نظام صدیقی اس حوالے سے کہتے ہیں کہ "اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بڑے نہ سہی لیکن اچھے، سچے، اہم اور معنی خیز ناول لکھے جا رہے ہیں۔"(۲۷) اور یہ بات ہمارے ان ناولوں کے مطالعے پر صادق آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) لارنس، ڈی۔ ایچ، فکشن۔ فن اور فلسفہ، مترجم: مظفر علی سیّد، (کراچی، مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۶ء)، ۳۶۔

(۲) فاکس، رالف: ناول اور عوام"، مترجم: ڈاکٹر سیّد محمود کاظمی، (لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۵۳۔

(۳) کنڈیرا، میلان: ناول کا فن، مترجم: ارشد وحید، (اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء)، ۲۵۔

(۴) یوسا، ماریو برگس: نوجوان ناول نگار کے نام خط، مترجم: محمد عمر میمن، (کراچی، شہر زاد، ۲۰۱۰ء)، ۱۴۔

(۵) مارکیز، گارشیا: فنِ فکشن نگاری (جلد اوّل)، مترجم: محمد عمر میمن، (کراچی، دانیال، ۲۰۱۶ء)، ۱۳۳۔

(۶) شہاب ظفر اعظمی: "اکیسویں صدی میں اُردو ناول: ایک تنقیدی مطالعہ"، مشمولہ: دربھنگہ ٹائمز، (ناول نمبر)، دربھنگہ، انڈیا، جلد نمبر ۱۲، شمارہ نمبر ۶، اپریل تا جون ۲۰۱۶ء، ۸۳۔

(۷) سیّد ارشاد حیدر، "کئی چاند تھے سرِ آسماں--ایک مطالعہ"، مشمولہ: خدا لگتی، مرتبین: لئیق صلاح، سیّد ارشاد حیدر، ریاست نگر، حیدر آباد، انڈیا، الانصار پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ۷۳۔

(۸) ایضاً، ۷۴۔

(۹) انتظار حسین، جزئیات پر مکمل مہارت، مشمولہ: خدا لگتی، ۲۹۸۔

(۱۰) شمس الرحمن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، (کراچی: شہر زاد، ۲۰۰۶ء)، ۵۶۱۔

(۱۱) ڈاکٹر شگفتہ حسین، "وزیر خانم: کردار نگاری کی ایک مثالی جہت"، مشمولہ: خدا لگتی، ۱۴۳۔

(۱۲) مشرف عالم ذوقی، آبِ رواں کبیر، (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۳ء)، ۱۰۸اور ۱۱۱۔

(۱۳) ایم۔خالد فیاض، ''اُردوناول:مابعد جدید تناظر''، مشمولہ: ادراک، گوجرانوالہ، شمارہ نمبر ۱۲، ستمبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء، ۹۱۔

(۱۴) مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا، (اسلام آباد: صریر پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۷۰۔

(۱۵) ایضا، ۱۲۲۔

(۱۶) تسنیم فاطمہ امروہوی، ذوقی: تخلیق اور مکالمہ، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء)، ۳۳۔

(۱۷) محمد اکرم خاں، ''پوکے مان کی دنیا''، مشمولہ: ''ذوقی: تخلیق اور مکالمہ''، ۳۷۵اور ۳۷۶۔

(۱۸) شمس الرحمن فاروقی، ''کچھ موت اور 'موت کی کتاب' کے بارے میں''، مشمولہ: موت کی کتاب از خالد جاوید، (کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۲ء)، ۱۴۷۔

(۱۹) آصف فرخی، ایک کہانی نئے مضمون کی، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ۱۵۰۔

(۲۰) خالد جاوید، موت کی کتاب، ۱۲۵۔

(۲۱) ایضاً، ۱۲۴۔

(۲۲) سید محمد اشرف، ''معاصرین کے لیے تشویش کا سبب''، مشمولہ: اِثبات، ممبئی، شمارہ نمبر ۱۰، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱ء، ۱۸۹۔

(۲۳) انیس اشفاق، خواب سراب، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۱۱۔

(۲۴) عبدالرحمن، ''خواب سراب: موجود متن پر تشکیل کردہ جدید بیانیہ''، مشمولہ: مکالمہ، کراچی، شمارہ نمبر ۳۵، اگست ۲۰۱۷ء، ۱۲۶۔

(۲۵) معید الرحمن، ''خواب سراب: انیس اشفاق''، مشمولہ: امروز، علی گڑھ، شمارہ نمبر ۳، جولائی تا اکتوبر ۲۰۱۷ء، ۲۰۲۔

(۲۶) ظہیر انور، ''خواب سراب: تہذیبی زوال کا الم آثار بیانیہ''، مشمولہ: ادبیات، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۱۲۳۔۱۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء، ۲۰۳

(۲۷) نظام صدیقی، نئے عہد کی تخلیقیت کا تیسرا انقلاب، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۹ء)، ۳۲۶۔

References

1. D. H. Lawrence: "Fiction: Fun aur Falsafa", mutarjim: Muzaffar Ali Syed, Karachi, Maktaba-e-Asloob, 1986.
2. Ralph Fox: "Novel aur Awam", mutarjim: Dr. Syed Mahmood Kazmi, Lahore, Aks Publications, 2019.
3. Milan Kundera: "Novel ka Fun", mutarjim: Arshad Waheed, Islamabad, Academy Adabiyat Pakistan, 2017.
4. Mario Vargas Llosa: "Naujawan Novel Nigar ke Naam Khat", mutarjim: Muhammad Umar Memon, Karachi, Sheherzad, 2010.
5. Gabriel Garcia Marquez: "Fun-e-Fiction Nigari" (Jild Awwal), mutarjim: Muhammad Umar Memon, Karachi, Daniyal, 2016.
6. Shamsur Rahman Farooqi: "Kai Chand Thay Sar-e-Aasman", Karachi, Sheherzad, 2006.
7. Musharraf Alam Zauqi: "Aab-e-Rawan Kabir", Dehli, Educational Publishing House, 2013.
8. M. Khalid Fayyaz: "Urdu Novel: Mab'ad Jadeed Tanazur", mashmoola "Idraak", Gujranwala, Shumara No. 12, September ta December 2021.
9. Musharraf Alam Zauqi: "Po ke Maan ki Duniya", Islamabad, Sarir Publications, 2019.
10. Tasneem Fatima Amrohvi: "Zauqi: Takhleeq aur Mukalma", Dehli, Educational Publishing House, 2014.
11. Asif Farrukhi: "Aik Kahani Naye Mazmoon ki", Lahore, Aks Publications, 2020.
12. Anees Ashfaq: "Khwab Sarab", Lahore, Sang-e-Meel Publications, 2018, Safha 11.
13. Nizam Siddiqui: "Naye Ahd ki Takhleeqiyat ka Teesra Inquilab", Dehli, Educational Publishing House, 2019.

❖❖❖